28

ہمارے کاموں کے اندر علمیت، افادیت اور ایثار پایا جانا چاہیے

(فرمودہ 17 نومبر 1950ء بمقام ربوہ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''قریباً تین مہینہ کے بعد اس ہفتہ میں میری کھانسی کی یہ حالت ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اب وہ ٹلنے والی ہے۔ دو دن تو ایک دفعہ بھی کھانسی نہیں اُٹھی۔ کل سے پھر اُٹھنی شروع ہوئی ہے۔ لیکن اُس کھانسی اور اِس کھانسی میں اتنا فرق ہے کہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ کھانسی ہٹنی شروع ہوگئی ہے۔ پہلے یہ احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن گلے کی سوزش، نزلہ اور آواز کی بندش بدستور ہے جس کی وجہ سے میں نہ تو اونچی آواز کے ساتھ بول سکتا ہوں اور نہ زیادہ دیر تک کھڑا ہوسکتا ہوں۔ مگر بہرحال جس طرح سینہ کی سوزش آہستہ آہستہ ختم ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم کے اضمحلال کی وجہ سے کھانسی آہستہ آہستہ دور ہورہی ہے۔ جب جسم میں طاقت زیادہ ہوتی ہے تو وہ بیماری کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوتا ہے اور جب طاقت کمزور پڑ جاتی ہے تو بیماری کا مقابلہ کرنا جسم کے لئے مشکل ہوتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بیماری دور کرنے میں جتنا دخل اُس طبعی طاقت کا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ودیعت کی جاتی ہے اُتنا دخل دواؤں کا نہیں ہوتا۔

میں نے پچھلے جمعہ میں جلسہ سالانہ کے کام کی طرف احباب کو توجہ دلائی تھی اور پھر یہاں سے جانے کے بعد میں نے خود اپنے سامنے بُلا کر کارکنوں کو نصیحت کی۔ چنانچہ دو تین دن سے جلسہ سالانہ کا کام مستعدی کے ساتھ شروع ہوگیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر میں توجہ نہ دلاتا تو چونکہ صحیح اندازے نہیں لگائے گئے تھے اس لئے غالب گمان تھا کہ اس سال جلسہ سالانہ دسمبر کی تاریخوں میں نہ ہوسکتا۔

ہمارے کارکنوں نے اِسی غلطی سے کام لے کر جس کا ہمارے ملک میں رواج ہے کہ ہم کسی کام کا قبل از وقت حسابی اندازہ نہیں لگاتے فرض کیا ہوا تھا کہ کام آپ ہی آپ ختم ہو جائے گا۔ جب پہلے دن صدر انجمن احمدیہ کا اجلاس ہوا تو انہوں نے مجھے ایک تحریر بھیج دی کہ سب انتظام ٹھیک ہو گئے ہیں۔ جب میں نے لکھا کہ سب انتظام ٹھیک ہو جانے کے یہ معنے ہیں کہ بتایا جائے کہ کتنی اینٹیں فی بیرک لگیں گی؟ کتنی بیرکیں بنانے کا ارادہ ہے؟ کتنی اینٹیں روزانہ تیار ہوں گی اور کتنے آدمی انہیں تیار کر سکیں گے؟ اور پھر کیا وہ آدمی مہیا ہیں؟ پھر کتنے گدھے اور دوسرے جانور اینٹیں ڈھونے کے لئے موجود ہیں؟ اور پھر وہ روزانہ کتنی اینٹیں لائیں گے؟ جب اِس طرح اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک سو پچاس دن میں یا کم از کم ایک سَو دن میں جا کر بیرکیں تیار ہوں گی۔ لیکن ہمارے پاس صرف تیس دن باقی ہیں۔ پھر جب عملی طور پر دیکھا گیا تو جو اندازہ لگایا گیا تھا وہ بھی غلط نکلا۔ کیونکہ یہ خیال کیا گیا تھا کہ ہم دس ہزار اینٹیں روزانہ تیار کرتے ہیں اور بیس ہزار روزانہ کل سے تیار کرنی شروع کر دیں گے۔ لیکن جب خود ناظر وہاں دیکھنے گئے تو صرف چار ہزار اینٹیں روزانہ تیار ہو رہی تھیں اور بیس ہزار روزانہ اینٹیں تیار کرنے کا قریب میں امکان ہی نہیں تھا۔ تب دَوڑ دھوپ کر کے پتھیروں کو تلاش کرنے کے لئے آدمی بھیجے گئے۔ لیکن ابھی تک صرف اتنی اطلاع ملی ہے کہ آدمی بھیجے گئے ہیں آگے کس حد تک انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کا ابھی پتا نہیں لگا۔ چونکہ جمعہ آ گیا تھا اس لئے میرے پاس آخری رپورٹ نہیں پہنچی۔ بہرحال اگر آدمی آ جائیں اور وہ پورے زور کے ساتھ کام کریں تب بھی ہم بمشکل ساٹھ بیرکیں بنا سکیں گے جن میں اُنیس ہزار کے قریب آدمی آ ئیں گے۔ بہرحال کچھ تو صورت پیدا ہونے کا امکان پیدا ہوا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح اب انجمن کے ناظروں نے کام کرنا شروع کیا ہے اگر اسی اصول کے مطابق کام کرتے رہے تو غالباً وہ جلسہ سالانہ کے مہمانوں کے لئے کچھ نہ کچھ سامان کر لیں گے۔

مگر جو چیز آج میں پھر پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی کسی کام کے کرنے سے پہلے اندازہ لگاتا ہے۔ قرآن کریم کو پڑھ لو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا 1۔ خدا تعالیٰ نے جب کسی کام کا ارادہ کیا تو پہلے اس کا اندازہ لگایا۔ اندازہ لگانے سے انسان صحیح طور پر کسی کام کو سمجھ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات انسان خیالی طور پر جو قیاس کرتا ہے وہ بعض دفعہ تو سو فیصدی غلط ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ کام شروع کرنے سے پہلے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگاتے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

ہمارے کاموں میں زیادہ خرابیاں قبل از وقت اندازہ نہ لگانے سے پیدا ہوتی ہیں۔

دوسرا سبب اِس کا یہ ہوتا ہے کہ لوگ اندازہ لگا لینے کے بعد صحیح طور پر کام نہیں کرتے۔ جو لوگ اندازے لگاتے ہیں درحقیقت قیاس کا نام اندازہ رکھ لیتے ہیں۔ حالانکہ صحیح اندازہ حسابی اندازہ ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ علم میں ترقی ہوتی ہے۔ ہر شخص روزانہ خط لکھتا ہے یا کچھ تحریر کرتا ہے۔ جب اس سے پوچھا جائے کہ وہ دن بھر میں کتنے صفحے لکھ سکتا ہے؟ تو شاید بڑی جلدی سے کہہ دے گا کہ میں دو تین سو صفحے لکھ سکتا ہوں۔ لیکن جب اُسے لکھنے پر بٹھا دو تو شاید یہ پتا لگے کہ وہ اندازہ جو اُس نے لگایا تھا اُس کا دسواں حصہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اِسی طرح مضامین لکھنے میں انسان قیاس کر لیتا ہے کہ وہ بہت سُرعت کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔ مگر عمل میں جا کر وہ بات بالکل اَور ہی نکلتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگ بڑی جلدی سے کہہ دیں گے کہ وہ سَو سَو صفحے لکھ سکتے ہیں یا شاید کوئی کہہ دے کہ وہ دن بھر میں صرف دس بارہ صفحے لکھ سکتا ہے۔ اور یہ دونوں اندازے غلط ہوں گے۔ میں نے عملاً جو لکھ کر دیکھا تو بہت زور دے کر ایک دن میں سَو کالم لکھا تھا۔ میری کتاب تحفۃ الملوک غالباً دو دن میں لکھی گئی تھی اور سَو سَو کالم روزانہ لکھا گیا تھا۔ میری کتاب ''احمدیت'' سات دن میں لکھی گئی تھی اور غالباً اوسط کالم سولہ کے قریب روزانہ بنتے تھے۔ اور میرے کام کا وقت چودہ پندرہ گھنٹے روزانہ ہوتا تھا۔ صبح سے کام شروع کرتا تھا اور رات کے بارہ بارہ بجے تک کام کرتا تھا۔ بیچ میں کچھ وقت کھانے پینے، پیشاب پاخانہ کرنے اور نمازوں پر بھی خرچ ہوتا تھا۔ فرض کرو اگر پانچ گھنٹے سونے کا وقت ہو اور تین چار گھنٹے نمازوں، کھانے پینے اور پیشاب پاخانہ وغیرہ کاموں پر لگ جائیں تو نو گھنٹے کے قریب ایسے کاموں پر لگ گئے اور پندرہ گھنٹے کام کے لئے نکل آئے۔ پھر ایک گھنٹہ کا میں نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ میں چھ سات کالم لکھ سکا ہوں۔ غرض میں نے تجربہ کر کے یہی کچھ دیکھا ہے لیکن اس سے پہلے اگر کوئی مجھ سے سوال کرتا تو شاید میں بھی کہہ دیتا کہ میں روزانہ سو ڈیڑھ سو صفحہ لکھ سکتا ہوں۔ لیکن میری عمر کا تجربہ یہی ہے کہ جو کچھ میں روزانہ لکھ سکا وہ سو کالم تھا یا شاید چار پانچ صفحے اوپر ہوں گے۔ بہرحال اوسط سو کالم ہی پڑتی ہے اور یہ بھی میں نے ایک ایک بجے رات تک لکھے تھے۔ پس حسابی اندازے لگانے کے بغیر انسان کو یہ پتا نہیں لگ سکتا کہ وہ کس قدر کام کر سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ مرض ہے کہ اول تو اندازہ لگائیں گے ہی نہیں یونہی تُک بندی کر دیں گے حالانکہ حسابی اندازہ اَور چیز ہے اور قیاس اَور چیز ہے۔ حسابی اندازے کے معنے

ہوتے ہیں حسابی بنیاد۔ اور قیاس کے معنے یونہی ٹُک بندی کے ہوتے ہیں۔

میں نے پہلے بھی کئی دفعہ ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ میں باغ کی سیر کر رہا تھا چلتے چلتے میں چکوترے کے ایک درخت کے پاس آیا۔ میرے پاس ایک مالی تھا جو پنجابی تھا لیکن ایک لمبا عرصہ ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے اس کے طور و طریق ہندوستانی تھے۔ میں نے چکوترے کے ایک درخت کو دیکھا تو اندازہ کیا کہ شاید 30، 40 ہزار پھول لگا ہوا تھا۔ میں نے مالی کو بلایا اور کہا۔ دیکھو! درخت پر کتنا پھول لگا ہے. اگر یہ سارے پھول رہ جائیں تو ایک ہی درخت کتنا پھل دے جاتا ہے۔ میں تو تصوف کے نکتہ سے اسے دیکھ رہا تھا کہ دنیا میں کتنی ہی قیمتی چیزیں ایسی ہیں جو ضائع ہو جاتی ہیں۔ لیکن مالی چونکہ آگے بڑھ کر بات کرنے اور خوشامدانہ بات کرنے کا عادی تھا اس نے کہا حضور! سارے پھل لگیں گے۔ میں نے کہا یہ تو بڑی تعداد میں پھول ہیں۔ اگر اتنے چکوترے اِس درخت پر لگ جائیں تو درخت کی ذرہ بھر بھی لکڑی باقی نہ رہے۔ یہ تو اس کا سواں حصہ بھی بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن وہ مالی کہے جا رہا تھا نہیں حضور اتنا پھل لگے گا۔ میں نے کہا اچھا جب لگے گا تو دیکھیں گے۔ لیکن جب اس درخت پر پھل لگا تو وہ صرف ایک چکوترا تھا۔ مالی جو کچھ کہہ رہا تھا وہ قیاس تھا۔ اگر وہ حسابی اندازہ لگاتا تو وہ پہلے یہ اندازہ لگاتا کہ اس درخت پر کتنے پھول لگے ہیں کیونکہ ایک ایک بالشت میں سَو سَوا سَو پھول لگتے ہیں لیکن وہ گر جاتے ہیں۔ مثلاً آم کا مَور[2] ہوتا ہے اگر وہ سارا پھل بنے تو ایک دو درخت کا پھل باغ کے پھل سے زیادہ ہو جائے کیونکہ ایک ایک چھلّی میں اتنا مَور ہوتا ہے کہ میرے خیال میں وہ چالیس پچاس آم کے برابر ہو جاتا ہے۔ باجرے کے برابر دانے ہوتے ہیں اور پھر وہ بالکل پاس پاس ہوتے ہیں۔ تو حسابی اندازہ یہ تھا کہ وہ دیکھتا درخت پر کتنے پھول لگے ہیں اور پھر کتنی تعداد میں چکوترے لگیں گے اور پھر یہ درخت کتنا بوجھ برداشت کر سکے گا۔ مثلاً ایک چکوترا اگر نصف سیر کا سمجھ لو تو ہزار چکوترے لگنے کے معنے ہیں کہ اُس درخت پر پانچ سو سیر یعنی ساڑھے بارہ من بوجھ پڑے گا۔ ایک سات فٹ کے درخت پر اتنا پھل اگر لگ جائے تو وہ تباہ ہو جائے۔ مالی تو کہتا تھا کہ اس درخت پر ہزاروں چکوترے لگ جائیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک درخت پر ہزار ڈیڑھ ہزار چکوترا بھی نہیں لگ سکتا اور پھر بڑا چکوترا تو غالباً سیر سیر کا بھی ہوتا ہے۔ اس حساب سے تو اڑھائی تین سو چکوترا لگنا بھی مشکل ہے۔ اور جہاں تک میرا تجربہ ہے ایک درخت پر ستّر اسّی سے زیادہ چکوترے نہیں لگتے۔ مالٹا کو دیکھ لو چکوترے کے مقابل

پر کتنا چھوٹا پھل ہے لیکن ریڈ بلڈ کے متعلق اندازہ ہے کہ ایک درخت پر دوسَو یا اڑھائی سو مالٹے لگتے ہیں۔اور یہ بھی قیاسی اندازے ہیں ہم نے تو اتنے مالٹے بھی ایک درخت پر لگتے نہیں دیکھے۔

پس حسابی اندازے سے ساری غلطیاں دور ہوجاتی ہیں اس لئے پہلے حسابی اندازہ لگانا چاہیے۔ اور پھر اس حسابی اندازے کو پورا کرنا چاہیے اور جب یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں چیز ایسے ہوتی ہے تو انسان کو چاہیے کہ وہ محنت کر کے اُس نتیجہ کو جو حسابی لحاظ سے نکلتا ہے پیدا کرے۔ ہمارے ملک میں لوگ عموماً یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کام یوں ہوگا پھر اگر وہ کام اُس طرح نہ ہوتو کہہ دیتے ہیں خدا تعالیٰ نے کوئی نحوست نازل کردی ہے کہ باوجود پوری کوشش کے ہمارا کام تباہ ہوگیا۔

غرض پہلے تو اندازہ نہیں لگایا جاتا اور جب وہ کام خراب ہو جائے تو ساری غلطیاں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کردی جاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے حضرت خلیفۃ المسیح الاول فرمایا کرتے تھے ہمارے ملک میں اللہ تعالیٰ کے معنے ہیں ''کچھ نہیں''۔ایک غریب سے غریب آدمی کے پاس ایک پیسہ ہوسکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہوسکتا۔اور اس کی تشریح آپ یوں فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص کنگال ہوجاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہم تو برباد ہوگئے گھر میں صرف اللہ ہی اللہ ہے۔آپ فرماتے تھے اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں۔غرض ہمارے ملک میں یہ مرض عام ہوگئی ہے کہ ہر عیب خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور ہر خوبی اپنی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

میں نے سندھ کی زمینوں پر اپنے ایک عزیز کو مقرر کیا ہوا ہے اس کے شروع میں یہ اندازے ہوتے ہیں کہ دس من کپاس یا بارہ من گندم فی ایکڑ نکلے گی۔لیکن آخر سال میں وہ ہمیشہ اس کے نصف یا دوتہائی پر آجاتا ہے۔ پھر کہہ دیا جاتا ہے ہم نے تو خوب کام کیا تھا لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی آفت آئی ہے کہ اس نے ہمارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ [3] میں بیمار ہوگیا ہوں شفاء اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ بجائے اِس کے کہ عیب خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے عیب کو اپنی طرف منسوب کرنا چاہیے کیونکہ بات بھی یہی درست ہے اور آئندہ اصلاح کی طرف توجہ بھی اِسی نظریہ سے ممکن ہوتی ہے۔ وہ کام صحیح ہو ہی کیسے سکتا ہے جس کا نتیجہ غلط ہو۔تم ایک سیر پانی کے اندر دو چھٹانک شکر ڈال دو اور کہو کہ پانی میٹھا نہیں ہوگا تو اسے کون مان سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ شکر ایک حد تک پہنچ کر پانی کو میٹھا کر دیتی ہے تم

اس قانون کو پورا کرلو پھراس کو غلط کرنے کے لئے پورا زور لگا لو تم اسے ہرگز غلط نہیں بنا سکتے۔ یا پانی میں اس حد تک کونین ملا لو کہ پانی کڑوا ہو جائے اور پھر پورا زور لگا لو کہ پانی کڑوا نہ ہو تو تم ایسا نہیں کر سکتے۔ خدا تعالیٰ کے قانون کو کوئی انسان بدل نہیں سکتا۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قانون تو پورا ہو لیکن نتیجہ غلط نکلے۔ خدا تعالیٰ کی طرف عیب منسوب کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری برکتیں جاتی رہتی ہیں۔ بے شک حادثات بھی آتے ہیں لیکن حادثات کبھی کبھی آتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ حادثہ قانون بن جائے اور قانون حادثہ بن جائے۔ مثلاً وبائیں پڑتی ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ ہر سال وبائیں پڑیں اور کبھی کبھی لوگ ان سے بچیں۔ یا لوگ بیمار ہوتے ہیں لیکن جوانی کی عمر میں کبھی کبھی بیمار ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ کسی ملک کے تمام لوگ جوانی میں بیمار رہتے ہوں۔ پس حادثہ بیشک آتا ہے لیکن حادثہ استثناء ہوتا ہے۔ اور قانون استثناء پر غالب ہوتا ہے استثناء قانون پر غالب نہیں ہوتا۔ اگر ایک شخص قانون کے خلاف دس سال بھی اندازہ کرتا چلا جائے گا تو وہ ہمیشہ ناکام رہے گا۔ ناکام رہنے پر اُسے سمجھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے اُسے ننگا کر دیا ہے لیکن ضدی انسان سارے حادثات کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ہر روز وہ غلط کام کرتا ہے اور اچھا اندازہ لگاتا ہے پھر نتیجہ خراب ہوتا ہے مگر وہ کہتا یہ ہے کہ میں نے تو ٹھیک کام کیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے ہی کوئی آفت نازل کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بُرا نتیجہ نکلتا ہے تو یا اُس کا کام غلط ہوتا ہے یا پھر اس نے کام کیا ہی نہیں ہوتا۔ ان دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوتی ہے۔ تم اگر اپنے کاموں کو درست بنانا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہی ہے کہ جب تم کوئی کام شروع کرو تو پہلے اُس کا حسابی اندازہ لگایا کرو۔ پھر حسابی طور پر یہ اندازہ لگاؤ کہ اس کو پورا کرنے کے لئے کیا کیا سامان ضروری ہیں۔ اور وہ پورے ہیں یا نہیں۔ یہ نہ کہو کہ فلاں افسر نے کہا تھا کہ بات یوں ہے مگر بعد میں وہ بات غلط نکلی کیونکہ خدا تعالیٰ نے تم کو عقل خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لئے دی ہے لوگوں کی باتوں پر اندھا دھند یقین کرنے کے لئے نہیں دی۔

پس ہر کام کے لئے ضروری ہے کہ اُسے شروع کرنے سے پہلے اس کا اندازہ لگایا جائے۔ پھر ضروری ہے کہ اس کے سامان کو دیکھا جائے کہ آیا وہ موجود ہیں۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ ان کو مناسب وقت اور مناسب جگہ پر مہیا کرنے کے سامان موجود ہیں یا نہیں۔ جب یہ اندازہ لگ جائے اور حساب سے معلوم ہو جائے کہ ہر چیز مکمل ہے تو پھر دیانتداری سے کام کرو۔ حساب میں بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں

مگر یہ نہیں ہوتا کہ تین کا پانچ ہو جائے یا پانچ کا تین ہو جائے۔ اندازے کے بعد بڑی غلطی تبھی ہو گی جب تم بددیانتی اور سُستی کرو گے۔ یا تو تمہارا اندازہ غلط ہو گا اور یا کام غلط ہو گا۔ اندازہ لگانے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس کو مجرم بنا سکتا ہے اور ثابت کر سکتا ہے کہ اس نے جو کہا تھا یا تو وہ غلط تھا اور یا اس نے اپنے عمل کے ساتھ اسے پورا نہیں کیا۔ یہی چیز اِس وقت مغرب کی کامیابی اور مشرق کی ذلت کا باعث ہو رہی ہے۔ یورپ کے لوگ کام شروع کرنے سے پہلے اس کا اسٹیمیٹ (Estimate) لگاتے ہیں۔ پھر وہ دیکھتے ہیں کہ وہ سامان جن کے ساتھ کام پورا ہو گا موجود ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد وہ پوری دیانتداری کے ساتھ کام کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کا ناکام ہونا ان کی ذلت کا موجب ہے۔ گویا ان کا خدا تعالیٰ کو نہ ماننا ان کے لئے فائدہ بخش ہو گیا ہے اور ہمارے لئے اس کا ماننا ذلت کا موجب ہو گیا ہے۔ کیونکہ یورپین لوگ اگر کسی کام میں ناکام ہو جائیں تو وہ یہ نہیں کہتے کہ خدا تعالیٰ نے یوں کر دیا ہے وہ تو خدا تعالیٰ کو مانتے ہی نہیں۔ لیکن ایک مسلمان خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے بے ایمانی کرتا ہے اور کہتا ہے میں نے تو پورا زور لگایا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے ایسا کر دیا ہے۔ گویا دنیا میں نور اور ظلمت کی جو دو طاقتیں ہیں ان میں سے نور کی طاقت یہ مسلمان ہیں اور ظلمت کی طاقت خدا تعالیٰ ہے۔ (نعوذ باللہ) شیطان کا جو کام تھا وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو خدا تعالیٰ کا کام تھا وہ اپنی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی ہتک ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ امید رکھے کہ خدا تعالیٰ اس کی مدد کرے گا تو یہ اس کی حماقت ہو گی۔ آخر وہ اس کی کیوں مدد کرے گا جب وہ تمام خرابیاں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ تو اُس شخص کی مدد کرتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح کہتا ہے میں اپنی غلطیوں سے بیمار ہوتا ہوں اور خدا تعالیٰ مجھے شفا دیتا ہے۔ اس کے کام کا اگر نتیجہ اچھا نکل آتا ہے تو وہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ خدا تعالیٰ نے یوں کر دیا۔ اور جب نتیجہ خراب نکلتا ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتا ہے کہ میں اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے ناکام رہا۔ اور برکت اُسی کو ملتی ہے جو عیب اپنی طرف اور خوبی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کہتا ہے میرے اس بندہ نے عیب اپنی طرف منسوب کیا ہے اور خوبی میری طرف منسوب کی ہے میں اس کا کام اچھا کر دوں تا خوبیاں میری طرف منسوب ہوں۔ اور جب کوئی ایسا نہیں کرتا تو خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ میں ایسا کیوں کروں۔ کافر کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب اُسے کوئی برکت ملتی ہے تو وہ

کہتا ہے یہ میری محنت کا نتیجہ ہے لیکن مومن کے متعلق آتا ہے کہ وہ تمام برکات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مانتا ہے۔

پس یہ **تین چیزیں یاد رکھو**۔ اول اندازے کے بغیر کوئی کام نہ کیا کرو۔ ہمارے ہاں اسٹیمیٹ (Estimate) اس کو کہتے ہیں کہ بجٹ بنے۔ حالانکہ اسٹیمیٹ بجٹ کا نام نہیں۔ بجٹ کے یہ معنے ہیں کہ ہم اس حد تک خرچ کر سکتے ہیں۔ اور اسٹیمیٹ کے یہ معنے ہیں کہ اگر وہ کسی عمارت کا اسٹیمیٹ ہے تو کتنا سامان، کتنے مزدور، کتنے راج اور کتنا وقت ہمیں درکار ہے۔ دوسرے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اتنی اینٹیں مل سکتی ہیں؟ اگر مل سکتی ہیں تو کہاں سے؟ پھر اگر بنوانی ہیں تو کہاں سے بنوائی جائیں گی؟ اور اس کے لئے کتنے مزدوروں کی ضرورت ہے؟ پھر ان کو اٹھا کر لے جانے کے لئے کون سے ذرائع ہیں؟ پھر عمارت بنانے کے لئے کتنے معماروں کی ضرورت ہے؟ کتنے مزدوروں کی ضرورت ہے؟ اور پھر آیا اتنے راج اور مزدور موجود ہیں؟ پھر جتنی لکڑی درکار ہے وہ کہاں سے ملے گی اور کیسے ملے گی اور کتنے دنوں میں ملے گی؟ جب اندازے صحیح ہو جائیں گے تو یقینی بات ہے کہ غلطی کرنے والا پکڑا جائے گا۔ کیونکہ جب سامان کی تعیین ہو جائے گی اور جتنے وقت میں وہ کام ہونا ہے اُس کی بھی تعیین ہو جائے گی تو ہر عقلمند یہی کہے گا کہ اب اگر نتیجہ غلط نکلا ہے تو یقیناً تم نے غلط کام کیا ہے۔ اگر واقع میں روپیہ موجود تھا اور جس سامان کی ضرورت تھی وہ موجود تھا تو بتاؤ وہ کام کیوں نہ ہوا۔ اگر دس سیر پانی موجود ہو جس سے ہم نے مہمانوں کو شربت پلانا ہے اور شکر بھی کافی موجود ہو اور پھر شربت تیار نہ ہو تو تم کیا کہہ سکتے ہو کہ شربت کیوں تیار نہیں ہوا۔ سیدھی بات ہے کہ تم نے سُستی سے کام لیا ہے اور شربت تیار نہیں کیا۔ غرض اندازے انسان کو جب وہ غفلت کرے مجرم بنا دیتے ہیں۔ اگر اندازے صحیح ہوں گے تو انسان کوئی وجہ پیش نہیں کر سکتا کہ وہ کام کیوں نہیں ہوا۔ بجٹ کے معنے تو توفیق کے ہیں اسٹیمیٹ کے نہیں۔ ہم نے دنیا فتح کرنی ہے۔ اور اگر ہم نے دنیا فتح کرنی ہے تو ہمارے کاموں کے اندر علمیت پائی جانی چاہیے۔ ہمارے کاموں کے اندر افادیت پائی جانی چاہیے، ہمارے کاموں کے اندر ایثار پایا جانا چاہیے۔ یعنی جو کام بھی ہم کریں وہ قَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا کے ماتحت کریں۔ اور جو کام بھی ہم کریں وہ ہمارے لئے اور دوسروں کے لئے فائدہ مند ہوں۔ پھر جو کام بھی ہم کریں جان مار کر کریں اور یہ سمجھ کر کریں کہ ان اندازوں سے بڑھنا ناجائز ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہمارے کام میں برکت پڑ جائے گی۔ کیونکہ

جب ہم تمام عیب اپنے اوپر لینے کے لئے تیار ہو جائیں گے تو خدا تعالیٰ بھی ہماری رعایت کرے گا۔ اور اگر کوئی حادثہ بھی پیش آ گیا تو وہ اس سے ہمیں بچالے گا۔ کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ خواہ مخواہ الزام اپنے اوپر لینے کے لئے تیار ہو جائیں گے انہیں میں اس حادثہ سے بچالوں۔ اور جب کوئی شخص خدا تعالیٰ پر الزام نہیں ڈالتا، جب وہ خود فخر نہیں کرتا، جب وہ نیکی کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا بلکہ ہر نیکی کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اسے حوادث سے بچالیتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر نبی کی جماعت کو بھی حوادث پیش آتے ہیں لیکن ان کی نسبت دوسروں کے حوادث سے کم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر خدا تعالیٰ قانونِ قدرت زیادہ جاری کرتا ہے اور استثناء کم استعمال کرتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ استثناء کو بالکل ہی مٹا دیا جاتا ہے اور صرف قانونِ قدرت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ میں اور میرے رسول ضرور غالب ہوں گے۔ اب اِس قاعدہ کے ساتھ کوئی استثناء نہیں۔ سمندر ہوا بن کر اُڑ جائیں، پہاڑ اُڑ جائیں، دریا خشک ہو جائیں، چاند اور سورج گر جائیں، تمام کا تمام عالَم تہ و بالا ہو جائے لیکن یہ قانون نہیں بدل سکتا کہ میں اور میرے رسول ضرور کامیاب ہوں گے۔ اب تک کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جو اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوا ہو، کسی نبی کو خدا تعالیٰ نے سو سال میں کامیابی دے دی ہو یا کسی کو اِس سے کم یا زیادہ عرصہ میں۔ لیکن کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جو کامیاب نہ ہوا ہو۔ پس جو شخص تمام الزام اپنے اوپر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ کو بَری قرار دیتا ہے اُس کے لئے خدا تعالیٰ بعض ایسے قانون جاری کر دیتا ہے جن میں استثناء نہیں ہوتا۔ اور جس قانون میں استثناء ہوتا ہے وہ بھی اس کے لئے کم از کم کر دیتا ہے۔ یعنی دوسروں کے ساتھ حوادث زیادہ پیش آتے ہیں لیکن اس کے ساتھ حوادث کم پیش آتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر خرابی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور ہر خوبی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔"

(الفضل مورخہ 26 نومبر 1950ء)

1: الفرقان: 3

2: مَوَر: آم کے درخت کا پھول۔ بُور

3: الشعراء: 81